(Thematic Study of some important Short Stories of Ghazanfar)

غضنفز کے چند اہم افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ

Written By: Sameera Rafique

Margalla Town, Islamabad- Pakistan

Key words: Artificial Environment**,** Context, Distorted Psychology, Events, Esoteric World, Fiction, Fundamental Human Issues, Important Ingredients, Story Lines, Modern Sensibility, Silent Spectators.

Abstract:

When I participated in the annual festival of fiction on the Alami Afsana Forum-2020, I got to read colorful fiction as usual. Among these short stories was a unique story of Mr. Ghazanfar named "Karrwa Tail'' on which my comments have also become part of the forum. Inspired by this story, I have read his other four short stories named "Saraswati Ashnan'', "Khalid Ka Khatna", "Missing Man", and "Message Alert Tone", and recorded my analysis I am presenting combined into one article.

These Short Stories of the amazing author immediately affect the heart. Not because of his known personality but because these stories contain all the important ingredients so that by reading, understanding, and feeling we can test the complete scenes and storylines, all the characters, and the psychology of the characters.

The context of his stories emerges from the native society. His stories deal with different levels of social problems, whether they belong to a single-family or all members of society. However, the themes of the stories appeal to the reader. As far as the characters of stories are concerned, all the characters express themselves in their space, time, and duration without boring the reader. They go on filling their own colors in the story in such a way that the whole scenario comes into sight without disturbing the central idea in terms of the nature of the events.

Important details and imagery evoke moods or feelings by making the environment colorful or gloomy as per the need. Most importantly, the writer himself presents in the text with all of his feelings, consciousness, awareness, emotions, and thoughts.

The central or other characters and the environment seem to be interconnected, and technically these pieces of literature do not seem to be fragmented. In fact, all the components are so combined to form unity by supporting each other. Moreover, the imagery appeals to the senses of the reader from beginning to end. What more could a piece of writing or literature have?

Waves of heartbreaking facts appear on or underneath the surface of the text to reveal the trampled psyche of the distressed people. The events of all the stories are probably filled with the author's inner moods. We can say that these writings are a clear picture of modern sensibility. In this context, there are joys on one side of the stories and sorrows on the other. There is grief and distorted psychology. Some people feel the burden of pain and inner turmoil, and some silent spectators temporarily lose themselves in the colors and fragrance of the artificial environment and forget themselves.

It is the perfection of creation that allows us to analyze the story through the eyes of the author's esoteric world and consciousness, as well as to enjoy the strokes of fiction by focusing on the robotic crowd moving in a straight line.

Not for a moment do you feel that the length has increased or that some end or link of the story has been broken and something has been left out of the pen? Covering major and fundamental human issues, the author summarizes them in his fiction with great beauty and meticulousness.

عالمی افسانہ فورم پر افسانوں کے سالانہ میلے ۲۰۲۰ میں شریک ہوئی تو ہمیشہ کی طرح رنگا رنگ افسانے پڑھنے کو ملے۔ انھی افسانوں میں محترم جناب غضنفر صاحب کا ایک منفرد افسانہ ''کڑوا تیل'' بھی شامل تھا جس پر میرا تبصرہ بھی فورم کا حصہ بن چکا ہے۔ اسی افسانے سے متاثر ہو کر میں نے ان کے دیگر چار افسانوں ''سرسوتی اسنان''، ''خالد کا ختنہ''، ''مسنگ مین'' اور ''میسج الرٹ ٹون'' کو پڑھ کر اپنے تجزیات قلمبند کیے ہیں جنھیں یکجا کر کے ایک مضمون کی صورت پیش کر رہی ہوں۔

فاضل مصنف کے یہ افسانے فوراً دل پر اثر کرتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان کے قلم سے سپردِ قرطاس ہوئے بلکہ اس لیے کہ ان میں وہ تمام اجزا ہیں جنھیں پڑھ کر، دیکھ کر، سمجھ کر، محسوس کر کے ایک مکمل منظر اور کہانی، اس کے سبھی کردار، کرداروں کی نفسیات کو جانچا پرکھا جا سکتا ہے۔

جس کانٹیکسٹ میں وہ کہانی کا خمیر اٹھاتے ہیں، وہ یہ معاشرہ ہی ہے اور اس میں مختلف سطح کے مسائل ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی ایک گھرانے سے ہو یا معاشرے کے تمام افراد سے جڑا ہو، بہر حال افسانوں کے موضوعات ہر حساس اور باشعور قاری کو اپیل کرتے ہیں۔ جہاں تک بات ہے افسانوں کے کرداروں کی تو تمام کردار اپنی جگہ، وقت اور دورانیے میں بنا کسی طول کے خود کو ظاہر کرتے اور کہانی میں اپنا اپنا رنگ بھرتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ مکمل منظر نامہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے اور واقعات کی ہیئت و نوعیت کے اعتبار سے مرکز بھی اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

پہلو بہ پہلو جزئیات نگاری اور منظر نگاری ضرورت کے حساب سے ماحول کو رنگین یا اداس بنا کر کیفیات یا محسوسات کو ابھارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں اور سب سے خاص بات ان تمام عناصر میں تخلیق کار بذاتِ خود جملہ حسیات، احساسات و جذبات، فکر و شعور اور بیداری کے ساتھ مرکزی حیثیت سے فن پارے کے اندر قلب بن کر دھڑکتا رہتا ہے۔

مرکزی یا دیگر کردار اور ماحول آپس میں مربوط دکھائی دیتے ہیں اور فن پارہ حصے بخروں میں بٹا معلوم نہیں ہوتا بلکہ تمام اجزا یوں گندھے ہیں کہ ہر ایک جزو دوسرے کو سپورٹ فراہم کرتے ہوئے اکائی کی تعمیر کرتا ہے۔ اس پر مناظر کی لفظی تصویر کشی بھی ایک مکمل تاثر کو شروع سے آخر تک برابر انگیخت کیے رکھتی ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی تحریر یا فن پارے کی اور کیا خصوصیات ہوں گی؟

متن کی زیریں ساخت یا سطح پر انتہائی دلدوز حقائق کی لہریں دکھائی دیتی ہیں۔ جو پامال شدہ نفسیات کے ناسور سے رِسنے والے مواد کے مترادف ہیں۔ انسان کے بنیادی مسائل، داخلی خلفشار، شکست وریخت اور باطن میں موجود اَن مٹ خلا مابعد جدید حسیت کے ہی زائیدہ ہیں جو بطورِ علامت افسانوں کا حصہ بن کر ابھرتے ہیں۔ تمام افسانوں کے واقعات شاید مصنف کی داخلی کیفیات سے مملو ہو کر ہی سپردِ اوراق ہوئے ہیں۔ گویا یہ تحریریں عصری حسّیت کا واضح منظر نامہ ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو افسانوں میں ایک طرف خوشیاں بھی ہیں — غم بھی ہیں، کرب جھیلتی اور مسخ شدہ نفسیات بھی ہے۔ ایسے انسان بھی ہیں جو درد و کرب اور داخلی آشوب کا بوجھ محسوس کرتے ہوئے حالات کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور ایسے خاموش تماشائی بھی ہیں جو ماحول کی رنگینیوں اور خوشبوؤں میں وقتی طور پر کھو کر اپنا آپ بھی بھلا دیتے ہیں۔ یہی تخلیق کا کمال ہے کہ تخلیق کار کے باطنی جہاں اور شعور کی آنکھ سے ہم کہانی کا فکری تجزیہ بھی کر پائیں اور ساتھ ساتھ ناک کی سیدھ میں چلتی بے شعور ربوٹک بھیڑ کو تھوڑی دیر کے لیے روک کر فکشن کے اسٹروکس کا لطف بھی اٹھا سکیں۔

ایک پل کو بھی محسوس نہیں ہوتا کہ طوالت بڑھ گئی یا کہیں سے کہانی کا کوئی سرا یا ربط ٹوٹ گیا ہو اور قلم سے کچھ چھوٹ گیا ہو۔ بڑے اور بنیادی انسانی مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے، مصنف نے انھیں بے حد خوبصورتی اور باریک بینی کیساتھ اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے۔

افسانہ ''کڑوا تیل'' میں سونٹے کی آواز اور بیل کی حالت محسوس کر کے پورے وجود میں جھرجھری سی آگئی، ایک لحظہ کو یوں لگا گویا اپنی روح پر کوئی کوڑے برسا کر جھنجھوڑ رہا ہو۔ یہ سب محسوس کرتے ہوئے مجھے مشہور و معروف نوبل انعام یافتہ ناول نگار J.M.Coetzee کا ناول ''رسوائی کی ساتویں سمت'' (Disgrace) یاد آگیا۔ جس میں مصنف نے جانوروں کی تباہ کن صورتِ حال کو کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حیوانات کی زندگی اور ان کے Ethical Issues کے لیے یہ بہترین افسانہ ہے جسے میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر افسانہ نہ ہوتا تو ایک بہترین ناول ضرور ہوتا کہ ایک مختصر سے منظر میں انتہا درجے کی مہارت سے حیوانات کے ساتھ برتے جانے والے سلوک کی بہت اعلیٰ اسلوب میں عکاسی کی گئی ہے.

اس تناظر میں یہ منظر اور مہارت ایک مختصر موضوع یا افسانے کا بیان نہیں رہ جاتا بلکہ اسے بڑی تحریر، بڑا افسانہ اور موضوع Declare کر دیتا ہے۔ اس پر سوز اور پر ملال افسانے میں جہاں تکلیف دہ جانور کی حالت زار یعنی (حاکم کا محکوم کے ساتھ برتاؤ) پورے منظر پر پھیلا ہوا قاری کے باطن کو جھنجھوڑتا ہے

تو وہیں گھومتے، پھرتے، چرتے جانور کی آزادی سے محکوم کی آزادی، تحفظ اور بہبود کو بھی کھلے میدانوں اور روشن چراگاہوں سے تشبیہ دے کر بہت خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ ایک باشعور قاری بھی فاضل اور محترم مصنف کی فکر اور احساس کی آنکھ سے دیکھ اور محسوس کر سکتا ہے۔

افسانہ ''سرسوتی اسنان'' بھی ایک بڑے افسانے کی حیثیت سے ادبی تاریخ میں اعتبار پانے کا حقدار ہے۔ افسانہ سرسوتی اسنان اپنے اندر جاندار، تحرک آمیز، تجسس اور ایڈونچر سے بھرپور وسیع منظر نامہ سمیٹے ہوئے ہے جو انسانی زندگی سے جڑے بہت بڑے حادثات اور واقعات سے جاملتا ہے۔

متنوع مسائل سے نبرد آزما انسانوں کا کرب گویا تخلیق کار کے باطن پر اترا اور پھر تحریر میں داخل ہو کر ہمارے دلوں میں بھی جگہ بنا رہا ہے۔ سرسوتی اسنان کے سفر میں قاری ایک ایڈونچر کا لطف اُٹھاتے ہوئے آگے سے آگے نئے مرحلے کا انتظار کرتا ہے۔ ابتدا سے ہی ذہن مہم کے سحر میں یوں گرفتار ہوتا ہے کہ محویت آخر دم تک قائم رہتی ہے۔ دیومالائی یا اساطیری ٹچ جہاں ایک طرف معلومات فراہم کرتے ہیں وہیں ایک مکمل کہانی کا تاثر بھی ملتا ہے۔

سفر کے دوران ہی مرکزی کردار پر دلگداز انکشافات ہونے لگتے ہیں۔ درجہ بہ درجہ آگہی کا در کھلتا ہے اور یوں متزلزل ہوتے انسانی سماج کے مختلف تناظرات سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔

کبھی ہجرت زدہ انسانوں کی دوڑ کا کوئی تناظر صحراؤں کی ہولناکی سے ابھرتا ہے تو یخ بستہ علاقوں کی جان لیوا ٹھنڈک میں جاڈو بتا ہے ٹھنڈک میں جاڈو بتا ہے۔ پھر بھوک کا چکر اور پیٹ کا دوزخ جسے انسان صدیوں سے بھوگتا آرہا ہے اور جو سب سے سنگین مسئلہ ہے، جس کے باعث ہر جا وسائل کے حصول کے لئے جنگ و جدل جاری ہے۔ اسی دوزخ کو بھرنے اور اس کی بھوک مٹانے کے واسطے انسان پرائے دیسوں میں مقتدر طبقوں اور سامراجی قوتوں کے ہاتھ کا کھلونا بن جاتے ہیں، بالکل دانوں پر جھپٹتے، کرتب دکھاتے بھوکے ہجرت زدہ پرندوں کے مانند، بھوکے عوام بھی ان دور دیسوں میں اپنے اپنے حصے کے کرتب دکھاتے اور ہر آن طاقتور گروہ کی نظر کے تعاقب میں قید کی حیثت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب اس قید کی طوالت اور سنگینیاں بڑھنے لگتی ہیں تو جان بچا کر اپنے وطن لوٹ آنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اسی تناظر میں دیکھیں تو مذہب بھی انسان کی بھوک مٹا نہیں پاتا۔ جب تک پیٹ خالی ہے مذہبی اعمال پر بھی عملدرآمد ناممکن ہے! حتی کہ بھوک کی اس آگ نے انسان کے ہاتھوں دوسرے انسانوں کی بولیاں لگوائیں، جسم فروشی کیلئے عورت کا وجود پامال کر ڈالا۔۔۔ بچوں کو ذبح کر ڈالا۔۔۔

مذہب کے نام پر قتل وغارت گری، دوسرے مذاہب کا انہدام اور اس کی روک تھام کے لئے خود کو قربان کر دینے والے انسان کی قربانی ابتک کے انسان کی قربانیوں اور سروائیول کا نوحہ ہے اور افسانے کا بڑا موضوع بھی جو نہایت چابکدستی اور پرکاری سے تشکیل شدہ متن کا حصہ بن کر تاریخ کے بیشتر مناظر کی بازیافت کے مصداق ہے۔

یہ افسانہ صارفی تہذیب کی اجارہ داری اور پھیلاؤ پر بھی کئی حوالوں سے ماتم کناں ہے۔ کیسے انسان تیزی سے اس جال میں جکڑتے چلے گئے اور فیکٹریاں زر کمانے کے لئے مستحکم کر دی گئیں۔ ایسی ہزاروں فیکٹریاں انسانوں کو پرندوں کی مانند ہی نئے سے نئے پراڈکٹ کی لالچ میں بہالے گئیں۔ انسان بھی پھڑ پھڑاتے پرندے کی مانند ہر نئی فیکٹری کے نئے سے نئے دانے (پراڈکٹ) کا خریدار ہونے لگا۔ یہاں تک کہ پانی میں ڈبکیاں لگاتے پرندوں کی مانند ایک دن انسان بھی اس عالمگیریت اور صارفیت کی دوڑ دھوپ میں پیٹ کے دوذخ اور مادی آسائشات کے حصول کے جہنم میں ہی ڈبکیاں کھانے پر مجبور ہو گیا۔ یوں پرندے اور دانے، ان کا بھوکا ہونا، جھپٹنا، ہجرت کر کے دریا پر آنا اور انسانوں کا ان کے کرتب دیکھ کر لطف اندوز ہونا، قریب ہی فیکٹریوں کا لگ جانا اور پھر انسانوں کی اندھا دھند بھاگ دوڑ افسانے میں بڑی اور نمایاں علامات بن کر اُبھرتے ہیں۔

گنگا جمنا اور ان کا سنگم اس افسانے کی ایک اہم علامت ہے۔ ایک ہی وطن، خطے یا سرزمین پر الگ الگ گروہ یا تہذیبوں کے تعصبات اور امتیازات میں جکڑے زخم خوردہ افراد سرسوتی اور اس کے اشنان کے صحیح معنوں سے بھی کیا واقف ہوں گے!

ان مسائل کو درست سمت میں سمجھنے کے لئے یہاں مجھے مشہور و معروف نفسیات دان ابراہم ماسلو کی تھیوری (Hierarchy of Needs) یاد آگئی جس کے مطابق بنیادی ضرروتیں ہی پوری نہ ہوں تو انسان Self-Actualization (نروان) کی منزل تک بھی نہیں پہنچ پاتا۔ کیونکہ سرسوتی تو اسی کو دکھائی دے گی جو شعور کو بلند و بالا بنائے، عمیق نگاہی اور دانش و بصیرت سے اپنے درون کے ساتھ ساتھ خارجی مظاہر کا علم بھی حاصل کرے اور انسان کے مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے ہمدردی کی نگاہ سے دیکھے۔

سفر کے آخری دوراہے پر کردار کی باطن کی آنکھ کھلنے پر اسے معمولاتِ زندگی اور ان کے عذاب کا مکمل ادراک بھی ہو جاتا ہے اور اس سیاق میں وہ سفر کے اختتام تک انسان کے وجودی کرب کا احساس بھی بخوبی کر لیتا ہے۔ گویا یہ سفر زندگی کا سفر ہے اور تمام واقعات اور باتیں انسانی مسائل اور تکالیف، مجموعی

انسانی کرب کے گیان دھیان کا مرحلہ ہو کر سامنے آتی ہیں، ملاح شاید تگ وتاز اور شعور کی تمثال ہے، انسان کی اصل معراج اور علم کی علامت ہے جس کی وساطت سے مرکزی کردار ان رازوں سے پردہ اٹھالیتا ہے جنہیں آج سے پہلے وہ یوں دیکھ نہ پایا تھا۔ پھر مرحلہ وار وہ نروان کی منزل کی جانب بڑھ جاتا ہے جو اسے شعوری طور پر آگہی، عمیق نظری اور فکر کا اعلیٰ مقام عطا کرتی ہے۔ مختلف مدارج طے کروا کر سوچ کو جلا بخشتی ہے کیونکہ ان سب سے گزر کر ہی صحیح معنوں میں اشنان یا باطنی اشنان کے فرق اور مفہوم تک رسائی ممکن ہے۔ اسی کے بموجب مرکزی کردار کی حرکات وسکنات میں بھی تبدیلی در آتی ہے اور مجموعی کرب اور احساس کے ہمراہ آخر میں وہ پرندوں کو عاجزی وانکساری سے دانہ ڈالتا ہے کیونکہ وہ جان جاتا ہے کہ پرندے کی بھوک اور ہجرت دراصل انسانی ہجرت اور کرب کا ہی استعارہ ہے۔ اس سعی میں جکڑے پرندے اور دریا میں بکھری ان کی لاشیں دراصل انسانی زندگی کی رائیگانی، بے چارگی اور مرگِ ناگہاں کی ہی تصویر اور تفسیر ہیں۔

افسانہ ''خالد کا ختنہ'' میں رواں، سادہ اور خوبصورت نثر نے کہانی کے مجموعی تاثر کو اثر انگیز بنا دیا ہے۔ تقریب کی تیاری اور گھر کی آرائش وتزئین کا اہتمام یوں کیا گیا جیسے حقیقتاً شادی کا ماحول ہو۔۔۔ کھانا، خوشبوئیں، افرادِ خانہ، زرق برق لباس، ہنستے مسکراتے چہکتے چہرے اور خوش گپیوں کا سماں خوشی کے مناظر پیش کرتے ہیں۔۔۔

جیسے ہی کہانی آگے بڑھتی ہے ہم یہ پڑھ کر چونک پڑتے ہیں کہ یہ خالد نامی بچے کے ختنے کی تقریب ہے۔ مہمان تقریب کے آغاز کے لئے منتظر ایک جگہ جمع ہیں۔ لیکن عین موقعے پر خالد غائب ہے جو افسانے کا ٹرننگ پوائنٹ ہے تکنیکی اعتبار سے اس جانب نہایت باریکی اور مہارت سے قاری کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ خالد کونے میں دبکا چھپا بیٹھا ہے اور ختنہ نہیں کرانا چاہتا۔ جس پر والدین اور رشتے دار کبھی کھلونوں اور ٹافیوں کا لالچ دے کر منانے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی بہادری کی بات کر کے بچے پر نفسیاتی وار کیا جاتا ہے جو معاشرے، سماج اور مذہب کے جبر کا مظہر ہے اور اس ایک مظہر کی تکمیل کی خاطر کیسے کیسے پاپڑ بیلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ خالد کو نیا کرتا پہنانے اور دُلہا بننے کی بھی ترغیب دلائی جاتی ہے۔ وہ ہر پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے شدومد کیساتھ ختنے سے انکار کرتا چلا جاتا ہے۔ جب والدین زبردستی پر اتر آتے ہیں تو خالد کی زبان سے ختنے کا انکار ان الفاظ میں ہوتا ہے:

ابو! آپ ہی نے تو ایک دن کہا تھا کہ جن کا ختنہ ہوتا ہے بدمعاش انہیں جان سے مار دیتے ہیں۔

جس کے جواب میں ماموں خالد سے مخاطب ہیں:

خالد بیٹے! اگر تم ختنہ نہیں کراؤ گے تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ تمہارا ختنہ نہ دیکھ کر تمھیں ختنہ والے بد معاش مار ڈالیں گے۔

افسانے میں جہاں ایک طرف ماحول کی رنگینی ہے وہیں تقریب میں سنگینی کا بھی منفرد رنگ دکھایا گیا ہے اور ایک خاص حد میں رہتے ہوئے فکشنل جملوں کے ذریعے سے ہی سوکالڈ روایات یا مذہبی مسائل سے جنم لینے والی منافرت، شدت پسندی، تضادات، اقلیت کے استحصال، جبر واستبداد اور دنگوں کی جانب ''بد معاش'' اور کبھی ''ختنے والے بد معاش'' کہہ کر دبے لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کے اختتام پر خالد قتل کے متعلق سن کر چار و ناچار ختنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے ایسی حالت میں کسی کو بھی کھلونوں، ٹافیوں، خوشیوں، نئے کُرتے اور دُلہا بنائے جانے کا ہوش ہوتا ہے نہ خبر نہ فکر۔

مصنف نے دکھایا ہے کہ سبھی کو ایک ہی فکر دامن گیر ہے اور وہ ہے شاید سماجی و مذہبی اقدار اور جبر کے ہاتھوں قربانی کا بکرا بنائے جانے کی، ذبح ہونے اور کرنے کی۔ موروثی اقدار کی کند چھری سے معصوم اور بے گناہ کو یرغمال بنانے کی۔

افسانہ ''مِسنگ مین'' عالمی صارفی معاشرے یا کارپوریٹ کلچر کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کلچر میں پروان چڑھتی نئی نسل کی بے جا آرزوؤں اور امنگوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ماں باپ کے جذبات مجموعی انسان کے درد و کرب یا کلی طور پر وجودی کرب کا بیانیہ بن جاتے ہیں۔ کہانی میں نیا گھر ہے اور اب گھر کو رنگ کرنے کی باری ہے۔ والد اور بچوں میں بحث چھڑ جاتی ہے، بچے بضد ہیں کہ وہ اپنی پسند کا رنگ کرائیں گے جو والد کی پسند کے رنگ سے کچھ گاڑھا ہے۔ باپ کا اصرار اپنی ہی پسند کے ہلکے رنگ پر ہے۔ ایک بچہ بحث و تکرار سے تنگ آکر کہہ دیتا ہے کہ پاپا آپ ضد کر رہے ہیں نا! یہ کہہ کر وہ منظر سے پرے تو ہٹ جاتا ہے لیکن والد کے دل پر یہ الفاظ بجلی بن کر گرتے ہیں انہیں اپنا بچپن اور وہ وقت یاد آجاتا ہے جب وہ خود بچے ہیں اور ان کے اپنے والد کا گھر میں ایک مقام اور منصب ہے اور مرکزی کردار کی ہر پسند و ناپسند والد کے انکار کے آگے مدھم ہو کر انہی کی خواہش میں تبدیل ہو جاتی ہے حتی کہ پسند کی لڑکی سے شادی بھی نہیں ہو پاتی۔ پھر مرکزی کردار جو کہ ایک باپ ہے، اپنے حالات کا تجزیہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جنریشن گیپ کے باعث کتنا بڑا خلا پیدا ہو چکا ہے، بچے اپنی ہر جائز و ناجائز بات منوا کر ہی دم لیتے ہیں خواہ وہ پسند کی جگہ پر مکان بنانا ہو یا پسندیدہ کالج میں داخلہ ہو یا من پسند موٹر بائیک یا گاڑی لینا ہی مقصود ہو۔

والدین اپنا خون پسینہ ایک کر کے بھی بچوں کی خواہشات پوری کر دیتے ہیں اس کے لئے وہ اپنا آپ بھی ختم کر دینے کو تیار ہیں جیسا کہ مرکزی کردار کی بیوی اس کے پاس آکر کہتی ہے کہ بچوں کو ان کی پسند کا رنگ کروا لینے دیں! آخر ہم نے کب تک زندہ رہ لینا ہے؟ ہمارے بعد انہی بچوں نے اس گھر میں رہنا ہے۔

افسانے کے مطابق یہاں بات زندہ رہنے، مرنے یا گھر میں رہنے یا چلے جانے کی نہیں!۔ اہم بات یہ ہے کہ جس باپ کا ایک منصب و مقام ہے جو ساری عمر بچوں کے لئے ہی جیتا چلا آیا، کیا اس کا اتنا بھی مقام اور عزت نہیں کہ اسے ایک بار اپنی منشا و رضا سے کچھ کر لینے کا حق دے دیا جائے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آج کے دور کی اولاد اور جنریشن گیپ کے باعث انہیں صرف اور صرف اپنی ہی خواہشات، خوشی، سہولت اور اغراض عزیز ہیں۔ خواہ اس کے لئے والدین کے جذبات ہی کیوں نہ مجروح ہوں!۔۔۔ ان کے پیار یا طاقت اور توانائیوں کا خون ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔

افسانہ ہمیں دکھاتا ہے کہ یہی والدین جب بچے تھے اپنے والدین کے آگے سر جھکائے جئے چلے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے والدین کو کبھی وہ تکالیف اس طرح نہ دی تھیں جو آج کے صارفی معاشرے کی اجارہ داری کی مرہونِ منت ہیں۔ مصنف کے نزدیک زندگی کے لیے جدوجہد اور مسلسل قربانیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا انسان اب شاید اپنے اصلی جوہر کو کہیں گم کر چکا ہے یا اپنے آپ کو تلاش کرنے میں خود کی مدد سے زیادہ اسے انہی رشتوں کی مدد کی ضرورت ہے جو اسے بطورِ مسنگ مین ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے ہیں۔

اپنوں کی چاہت اور محبت کے رنگ سے زیادہ ان کی ضد، بے حسی اور بے جا اغراض کا گاڑھا رنگ سر چڑھ کر بولتا اور دکھتا ہے۔ جس کے سامنے باقی سارے رنگ پھیکے پڑ چکے ہیں یا پھیکے دکھائی دیتے ہیں۔

افسانہ ''میسج الرٹ ٹون'' پڑھتے ہوئے ابتدائی پیرا گراف سے ہی دلچسپی بڑھنے لگتی ہے، مگر آگے جا کر کیا ہو گا معلوم نہیں۔ تاثر قلمبند کرتے ہوئے دل پر ابھی بھی لرزہ طاری ہے۔

افسانے کی ابتدا میں جو آئیڈیا چندر پرکاش نے تحریر کیا (چندر پرکاش افسانے کا مرکزی کردار ہے) اسے پڑھ کر میرے لبوں پر مسکُراہٹ کھیلنے لگی۔ جو آخری جملہ ''آپ کا بھاری پن غائب ہو جائے گا اور آپ پھول کی طرح ہلکے ہو جائیں گے۔۔ ہم سے رابطہ کیجئے''۔۔۔۔ تک قائم رہتی ہے اور کہانی کا آغاز

اور مطلب سجھانے لگتی ہے۔آگے چل کر خوبصورت جملے بھی پڑھنے کو ملے جیسے :''جواُن کے انگوٹھے کے رقص کے جواب میں داد کے طور پر اُبھری تھیں۔''

افسانے سے عیاں ہے کہ کس طرح انسانی نفسیات خصوصاً احساساتی وجذباتی سطح پر گھٹن زدہ دائروں میں مقید ہو کر حبس زدہ آلودگی کی شکار ہے۔انسان خود کو ٹٹولنے کی بجائے بڑی آسانی سے اپنے بنائے ہوئے جہنم زار سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔حیرت کی انتہا تو یہ ہے کہ برسوں بیت جانے پر بھی انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ساتھی کو کس صحرا میں دھکیل رہے ہیں کہ قریب ہوتے ہوئے بھی محبت پنپ نہیں پاتی اور پیاس بجھتی نہیں اور آس بھی کبھی نہیں مٹتی۔۔۔ایسے میں کوئی زرخیز پل، کوئی خوشگوار ہوا کا جھونکا انہیں میسر آجائے تو جیسے بنجر زمین پر کوئی پھول سا کھل اٹھتا ہے۔اب ایسے پھولوں کو کھلنے اور ذات کی سیرابی کی غرض سے آج کے انسان کو نہ مذہب، نہ ہی کوئی رسم ورواج اور اقدار اور نہ ہی معاشرے کی پرواہ رہتی ہے۔اپنوں کے ہوتے بھی دوسروں سے رشتے تیزی سے پروان چڑھنے لگتے ہیں پر جب تک عقل ٹھکانے آتی ہے بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ذہن اپنے محور سے ہٹ کر کہیں اور کھونے لگتا ہے۔سب جانتے ہوئے بھی خود کو بہلا پھسلا کر کہیں اور بہنے اور بہلنے لگتا ہے۔جیسا کہ چندر پرکاش کے ساتھ بھی کہانی کے اختتام پر ہوا۔جو ان جملوں سے بالکل واضح ہے:

''تحریر انباکس سے نکل کر آؤٹ باکس میں پہنچ گئی۔۔۔حرف خط وخال میں تبدیل ہونے لگے۔۔۔آہستہ آہستہ تصویر بننے لگی۔۔۔نگاہیں نئے رنگ و روغن کی طرف کھنچنے لگیں''۔۔۔

دورانِ قرات بارہا نظریں کہیں ٹھہرنے سی لگتی ہیں۔۔دماغ کہیں کھونے لگتا ہے۔۔دل پر لرزہ طاری ہونے لگتا ہے۔۔۔میسج الرٹ ٹون کی طرح ذہن پر کوئی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔۔۔یہ الرٹ ٹون یا گھنٹی سماج کے ہر فرد کے لئے ہے تاکہ وہ تھوڑا ٹھہر کر سوچے اور اپنا محاسبہ کرے۔

مرکزی کردار کی عجیب حالت ہونے لگتی ہے۔۔۔اپنا کیا دھرا سب اسے یاد آنے لگتا ہے۔ہر غم و غلطی کے پسِ پردہ وجوہات کی بازیابی ہونے لگتی ہے۔ تکلیف اور سچ کی شدت جھنجوڑ جھنجوڑ کر پکارنے اور کہنے لگتی ہے:

دیکھو خود کو!۔۔۔سوچو سب کو!۔۔۔ٹٹولو خود کو!۔۔۔کھولو سچ کو!۔۔۔جانو سب کچھ!

کہیں کوئی صحرا، کوئی نرکھ تم نے اپنے گرد تو نہیں بنالیا؟ یا کھڑا کر لیا؟ جس کی ریت کی گرد سے تمھاری اپنی آنکھیں بھی دھندلا گئی ہوں؟ اور جب کھلیں تو مکمل طور پر اس کی لو اور گرمائش کی لپیٹ میں آجائیں اور تمہارے لئے اپنا ہی کوئی نخلستان نہ بچے! جس کی خواہش میں تم بھی بھٹکنے لگو اور دور جا نکلو۔ بظاہر تو دو لوگ ساتھ ہوں مگر ذہنی اور روحانی طور پر اپنے ہی تشکیل کردہ میکانکی جہان میں زندہ لاش بن کر جئیں۔ مگر جب سانس لیں تو کہیں بہت دور جا کر۔۔ لیکن وہ بھی ادھوری سانسیں جنہیں ان دائروں کے ہوتے پوری طرح جیتا کون ہے؟

داخلی شکست وریخت کے عمل سے گزر کر، آج کا انسان وجودی کرب کا بوجھ اُٹھائے، روحانی دیوالیہ پن اور مفلوج پن کا شکار ہے۔ افسانہ پڑھ کر اس کی سچائی اور شدت کا بھرپور انداز ہے۔ انسان کے جہاں اور بھی مادی مسائل ہیں وہاں روحانی ضرورتیں بھی ہیں۔ Self Esteem وہی پنپتی اور تسکین پاتی ہے جہاں ذہن و دل کے کھلنے اور زندہ رہنے کو مناسب ماحول، ہم آہنگی، پیار محبت، قدر اور دوستی جیسے جذبے پروان چڑھتے ہوں۔ بصورت دیگر مادی دوڑ کی پریشانی و سنگینی اور مسائل کے ہمراہ ساتھی یار شتے ناطوں کا ناروا سلوک انسان کو اندر سے بھی مکمل طور پر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ افسانے میں اس موڑ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اپنے ساتھی کی ضرورت نفس کا کیا مداوا ہو؟ دباؤ بڑھ جائے تو نتیجہ کچھ اور ہی برآمد ہوگا۔۔ ہم کیوں نہ اس مسئلے کی بنیاد تلاش کر کے اسے ٹھیک کریں (افسانے کے پیغام کے مطابق) جبکہ ان مسائل کی جڑیں بھی افسانے میں موجود ہیں۔۔۔ دکھائی بھی دے رہی ہیں۔۔۔ بس تھوڑا ٹھہر کر سوچنے کی ضرورت ہے۔

افسانے میں واضح طور پر ایسے اشارے موجود ہیں جو انسانی معاشرے، اس کے اہم جُز، خاندان، رشتوں، سماجی ضرورتوں کو کارپوریٹ اداروں اور صارفی تہذیب کی زد پر بکھرتا ہوا دکھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مذہب، رسوم و اقدار اور ان سب سے بڑھ کر انسانی نفسیات بھی مجموعی طور پر اس جکڑ بندی یا چنگل میں برے طریقے سے پھنس چکے ہیں جس سے نکلنا اب مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں ایک طرف ذہنوں کو خواب اور جذبات بیچ کر منافع خوری کا دور دورہ ہے تو دوسری جانب بیچنے والوں کی بے توجہی، لالچ اور اغراض کے اثرات کی لپیٹ میں ان کے اپنے پیاروں کے خواب اور جذبوں کے بھی بہت سے خریدار گھات میں ہیں، یوں اس عالمی منڈی میں پیار اور اخلاص کا مندا Recession ہے۔ جذبوں، رشتوں اور خوابوں کا بھاؤ

تاؤز وروشور سے جاری ہے۔ ہے۔ بیچنے والے بھی خریدار ہیں اور جو خریدار ہیں وہ از خود کہیں نہ کہیں کسی درجے پر تاجر بن بیٹھے ہیں، اس طرح ہر دو سطح پر سودے بازی کا سماں بندھتا دکھائی دیتا ہے۔

اس تناظر میں یہ افسانہ انسانی نفسیات، احساس و جذبات کے آشوب کا اظہار یہ ہے۔ اور نت نئی پیچیدگیوں کے حال سنا کر، انسان کے خلا کو پُر کرنے کے ذرائع دکھاتا اور بتاتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ انسانی ذہن اپنی کمیوں کو پورا کرنے کے لئے، سماج کے جبر اور قانون کی بالادستی کے باوجود بھی ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنی راہیں نکال لے گا۔۔۔ لہذا ضرورتوں اور تسکین کے سامان کے پیشِ نظر اغراض کی اس عالمی منڈی میں خواہش اور تکمیل کی طلب اور رسد کا کھیل مزے سے کھیلا جا رہا ہے۔ اور نفسیاتی تقاضے بھی اب عالمگیریت اور کارپوریٹ سماج کی بھینٹ چڑھ کر اکنامکل مقاصد بن چکے ہیں۔ جس سے ہم سب یوں نبرد آزما ہیں کہ اس سے اب کوئی مفر ہی نہیں۔

صارفی تہذیب کی دین ایک طرف انسانی بکھراؤ ہے تو دوسری طرف ذات کی پامالی۔۔۔ اگرچہ خود کو بہلانے کے ذرائع اور چور دروازے بھی میسر ہیں لیکن اس ایک سطح سے مزید اوپر جا کر پورے عالمِ انسانیت کا جائزہ لیں تو مادی معاشرے میں داخلی تنہائی کے شکار انسان کے خلاؤں کو مالی اور جنسی آسودگی بھی پُر نہیں کر سکتی۔۔۔ لہذا اس سماجی حیوان کی کیفیت De- Humanization کی بلند سطح کو چھو رہی ہے۔

References:

1. **Ghazanfar, Karwa Tail, Short Stories; Hairat Farosh, Edacational Publishing House, (Delhi - India) 2006, Pg. no: 15- 20**

2. **Ghazanfar. Sarsaswati Asnaan, Short Stories; Parking Area, Educational Publishing House, (Delhi - India) 2015, Pg. no: 9- 32**

3. **Ghazanfar, Khalid Ka Khatna, Short Stories; Hairat Farosh, Educational Publishing House, (Delhi - India) 2006, Pg. no: 48- 54**

4. **Missing Man, Short Stories; Parking Area, Educational Publishing House, (Delhi - India) 2015, Pg. no: 224- 228**

5. **Message Alert Tone, Short Stories; Parking Area, Educational Publishing House, (Delhi - India) 2015, Pg. no: 168- 180**